فقہی اختلافات کی حقیقت

مولانا سیّد جلال الدین عمری

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

برصغیر کی ملت اسلامیہ کو پہلے ہی کچھ کم مسائل درپیش نہیں تھے کہ اب اس نے اپنے لیے ایک اور مسئلہ پیدا کرلیا ہے۔ تقلید اور عدم تقلید کی وہی پرانی بحث، جس نے ماضی میں ملت کے اندر زبردست انتشار پیدا کیا تھا، اس کے اثرات اگرچہ ابھی تک باقی ہیں، مگر آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے۔ یہ بحث صرف کچھ جماعتوں کے رسائل اور جرائد تک ہی محدود تھی۔ مگر اب حال ہی میں رونما ہونے والے کچھ واقعات نے یہ افسوس ناک بحث پھر سے زندہ کردی ہے۔

سہ روزہ 'دعوت' نے اُن مباحث اور مسائل میں الجھنے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے، جن سے ملی انتشار کو خواہ مخواہ بڑھاوا ملتا ہو۔ تقلید و عدم تقلید کی حالیہ نزاع کے سلسلے میں بھی اس کا یہی رویہ رہا۔ اس نے محض دوچار مختصر تحریروں کے ذریعے اپنا اصولی موقف ظاہر کرنے ہی پر اکتفا کیا۔ تاہم صورتِ حال کی سنگینی کے پیش نظر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس سلسلے میں کسی ایسے عالم دین کا موقف سامنے لایا جائے، جو زیر بحث مسئلے پر غیر جانب دارانہ گفتگو کرسکتا ہو اور اس کا تحریک اسلامی سے بھی براہِ راست تعلق ہو اور فقہ و حدیث سے بھی۔ چنانچہ اسی مقصد و ضرورت کے پیش نظر سہ روزہ 'دعوت' کی طرف سے تحریک اسلامی کی صفِ اول کے قائد و رہنما مولانا سید جلال الدین عمری کو اس بات کی زحمت دی گئی کہ وہ جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمے دار کی حیثیت سے انٹرویو کے ذریعے موجودہ نزاعی مسئلے میں اپنا موقف واضح فرمائیں۔

مولانا سید جلال الدین عمری سے علمی اور تحریکی دنیا بہ خوبی واقف ہے۔ موصوف جماعت اسلامی ہند کے امیر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے شیخ الجامعہ، سہ ماہی علمی جریدے 'تحقیقاتِ اسلامی' کے مدیر، مشہور علمی و تحقیقی ادارے، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے صدر، تصنیفی اکادمی دہلی کے چیئرمین اور متعدد دینی، علمی

اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مسئلہ زیر بحث کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے علمی، عملی اور اصولی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ مسئلے کے تمام فریق سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے۔

دعوت کے لیے مولانا موصوف سے یہ گفتگو جناب عقیدت اللہ قاسمی نے کچھ متعین سوالات کی بنیاد پر کی تھی۔

مولانا موصوف کا یہ انٹرویو 'دعوت' کے ۱۶؍جولائی ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ توقع کے مطابق انٹرویو بہت پسند کیا گیا اور ہر طرف سے فرمایش آنے لگی کہ اسے کتابچے کی شکل میں شائع ہونا چاہیے۔ لہٰذا مولانا موصوف کے سامنے جب یہ بات آئی تو انھوں نے اس پہلو سے اس پر نظر ثانی کر کے اسے مزید سنوار دیا۔ بعض وہ نکات بھی نمایاں کیے جو پہلے نہیں آ سکے تھے۔ اس طرح یہ انٹرویو اُن حضرات کے لیے بھی قابل مطالعہ بن گیا، جو دعوت میں اسے پڑھ چکے ہیں۔ اب یہ ایک کتابچہ کی شکل میں پیش ہو رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے اعلیٰ معیار پر اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

امید ہے کہ فقہی اختلافات جیسے نازک مسئلے پر مولانا عمری کی یہ تحریر ملت کے تمام مکاتب و مسالک کے ذمے داروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور عوام و خواص دونوں اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

یہ پیش لفظ ۲۱؍اگست ۲۰۰۱ء کو لکھا گیا تھا۔ اب نئے ایڈیشن کے لیے اس میں کسی قدر تبدیلی کی گئی ہے۔

پرواز رحمانی
چیف ایڈیٹر سہ روزہ 'دعوت' نئی دہلی
۲۲؍مئی ۲۰۱۲ء

طبع چہارم

پیشِ نظر کتابچہ میں فقہی اختلافات سے متعلق بعض سوالات کا ہلکے پھلکے اور سادہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ یہ اس سے قبل تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اب کی بار میں نے اس پر ایک نظر ڈال کر مزید بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور کسی قدر نئے مواد کا اضافہ بھی کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں، انھیں مختلف مکاتبِ فقہ کے اصحاب نے ایک معتدل اور متوازن نقطۂ نظر کی حیثیت سے دیکھا اور فقہی اختلافات کی شدت کو کم کرنے میں مفید قرار دیا۔ اسی افادیت کے پیش نظر جماعت کے بعض حلقوں نے اسے بڑی تعداد میں پھیلایا۔ ٹمل زبان کے جریدے 'سمرسم' میں یہ شائع ہوا تو قارئین کے مطالبہ پر اسے کتابچہ کی شکل دی گئی۔ اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور امت میں اتحاد و اتفاق کی راہیں ہموار ہوں۔

جلال الدین

۲ رجنوری ۲۰۱۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہی مسالک کی اصولی حیثیت

سوال:

مولانا محترم! آج کل تقلید اور عدم تقلید کے موضوع پر زوردار بحث چھڑی ہوئی ہے۔ فریقین اپنے اپنے انداز سے دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے ملت کے ایک بڑے طبقے کو اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ میری خواہش ہے اور گزارش بھی کہ اس سلسلے میں آپ ہماری رہ نمائی فرمائیں اور بتائیں کہ اسلام میں فقہی مسالک کی آئینی اور اصولی حیثیت کیا ہے؟

جواب:

اسلام میں فقہی مسالک کی ایسی کوئی قانونی یا آئینی حیثیت نہیں ہے کہ ان پر چلنا اور عمل کرنا فرض یا واجب ہو، البتہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور سے جو فقہی مسالک رائج ہیں، چاہے وہ فقہ حنفی ہو یا فقہ شافعی یا فقہ مالکی و حنبلی ــــ ان چاروں کے علاوہ اور بھی فقہی مسالک ہیں ــــ ان پر امت کا اعتماد رہا ہے اور یہ اعتماد مسلسل چلا آ رہا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی دور میں امت نے ان تمام مسالک کو یکسر مسترد کر دیا ہو۔

فقہی مسالک پر امت کے اعتماد کی بنیاد

سوال:

مولانا محترم! امت کے اعتماد کے سلسلے میں ذرا وضاحت فرمائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا پوری امت کا ان پر اعتماد رہا ہے یا ان پر اجماع ہو گیا ہے؟ اور اس بات کی بھی وضاحت فرمائیں کہ اس اعتماد کی بنیاد کیا ہے؟

جواب:

میں اجماع کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا، البتہ اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ امت کی بہت بڑی

اکثریت بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امت کا ۸۰، ۹۰ (اسّی، نوّے) فی صد حصہ، ان چار مسالکِ فقہ پر اعتماد کرتا چلا آ رہا ہے۔ رہا آپ کا یہ سوال کہ اس اعتماد کی بنیاد کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتماد اس وجہ سے ہے کہ ان کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے اور کتاب وسنت کی روشنی میں ہی ان مسالکِ فقہ میں مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔

سوال:

مولانا محترم! ابھی آپ نے فرمایا کہ کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے ان تمام مسالک کو یکسر مسترد کر دیا ہو۔ بہ راہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔ اس لیے کہ 'دعوت' کے قارئین میں ایک بڑا طبقہ کم تعلیم یافتہ کا بھی ہے۔

جواب:

میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا کہ امت نے ان تمام مسالک کو کسی دور میں کلی طور پر رد کر دیا یا ناقابل قبول قرار دیا ہو، البتہ ان کی رایوں میں سے کسی سے اتفاق اور کسی سے اختلاف رہا ہے۔

مسالکِ فقہ سے ائمۂ حدیث کے اختلاف کی حقیقت

سوال:

آپ اس بارے میں کیا کہیں گے کہ ائمۂ حدیث یا وہ اصحاب جنہیں اہل حدیث کہا جاتا ہے، ہمیشہ تقلید اور تقلیدی مسالک کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

جواب:

ایک بات تو یہ ذہن میں رہے کہ بہت سے ائمۂ حدیث کی بھی ان فقہی مسالک کی طرف نسبت رہی ہے، کسی کو حنفی کہا گیا تو کسی کو شافعی۔ دوسری بات یہ کہ میرا منشا یہ نہیں ہے کہ ان مسالکِ فقہ سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ خود ان میں سے بعض نے بعض سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ فقہ حنفی جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے، جس میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ اور بعد کے اصحاب نے مسائل کی توضیح کی ہے، اس پر فقہ شافعی کے علماء نے زبردست تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ فلاں فلاں مسئلے میں قرآن کو سمجھنے یا احادیث کے معاملے میں امام ابوحنیفہ کو یا ان کے اصحاب کو تسامح ہوا ہے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پوری امت نے حنفیّت،

شافعیت وغیرہ سب ہی مسالکِ فقہ کو رد کر کے الگ کوئی راہ نکالی ہو۔ جہاں تک اعتراض اور تنقید کا تعلق ہے، احناف نے شوافع کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کیے ہیں۔ اسی طرح شافعی علماء نے احناف اور دوسرے علماء کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ بعض مسائل سے اختلاف کرنا اور بات ہے اور تمام مسالک ہی کو رد کر دینا بالکل مختلف بات ہے۔

محدثین کرام کے ہاں بھی یہی ہوا ہے۔ ائمۂ حدیث نے بہت سے مسائل کے ذیل میں بتایا ہے کہ اس سلسلے میں فلاں کا یہ مسلک ہے اور فلاں کا یہ۔ چناں چہ امام ترمذیؒ جب احکام سے متعلق کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو ساتھ ہی بالعموم یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث پر فلاں فلاں نے عمل کیا ہے اور فلاں فلاں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ساتھ ہی اختلاف کی بنیادیں بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی اپنے انداز میں دوسری فقہوں کے بعض مسائل پر تنقید کی ہے۔ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دراصل کتاب وسنت کی روشنی میں فقہی رایوں کا اظہار ہے۔

ایک ہی فقہی مسلک کے علماء کے درمیان اختلافات

سوال:

مولانا محترم! فقہی اختلاف تو ایک ہی مسلک کے علماء اور ائمہ میں بھی رہا ہے، جیسا کہ آپ نے ابھی بتایا۔ خود امام ابوحنیفہؒ سے ان کے شاگردوں کا اختلاف ملتا ہے۔ بعض مسائل میں ان کی رائیں بھی مختلف رہی ہیں۔ یہاں تک کہ بعد کے ادوار میں بھی علماء احناف ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں؟

جواب:

آپ نے ٹھیک کہا۔ اس طرح کے اختلافات تمام فقہی مسالک میں رہے ہیں۔ فقہ حنفی میں جہاں عام طور سے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، متعدد مسائل ہیں، جن میں بعد کے فقہاء احناف نے کہا ہے کہ ان مسائل میں ہمارے نزدیک صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے زیادہ قوی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں امام محمدؒ کی رائے زیادہ معتبر ہے، کبھی امام صاحب کے

ایک تیسرے شاگرد امام زفرؒ کی یا بعد کے کسی محقق کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

قولِ امام کو صحیح حدیث پر ترجیح نہیں ہے

سوال:

تقلید کے قائلین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کسی مسئلے میں حدیث صحیح پیش کی جاتی ہے تو ان ائمہ کے ماننے والے اس کے خلاف اپنے امام کی رائے کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا قولِ رسول پر امام کے قول کو ترجیح حاصل ہے۔ یہ رویہ شانِ رسالت کے خلاف ہے۔ اس سے اس عقیدہ کی تردید ہوتی ہے کہ ہم کتاب وسنت کو ماخذ دین سمجھتے ہیں۔

جواب:

یہ بات جس بھیانک طریقے سے پیش کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ جب کسی حدیث کے مقابلے میں امام ابوحنیفہؒ یا کسی دوسرے امام کی رائے کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ اس مسئلے میں حدیث پیش کر رہے ہیں، لیکن فلاں امام کی تحقیق، جسے دنیا ایک عام عالم دین ہی نہیں، صدیوں سے فقیہ دوراں تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے، اس کی تحقیق دوسری ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے دلائل سے واقفیت نہیں ہے، لیکن اس امام کی تحقیق پر آپ کی رائے اور دلائل کے مقابلہ میں زیادہ اعتماد ہے۔ اس پر یہ کہنا کہ کسی امام کی رائے کو حدیثِ رسول پر ترجیح دی جا رہی ہے، ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس کا وہ بے چارہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کے دلائل سے وہ مطمئن ہو جائے تو وہ آپ کی رائے پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ اسے اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آج آپ کسی کو حدیث کے حوالے سے کوئی مسئلہ بتائیں اس کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ شہر کے فلاں عالم نے دوسری بات بتائی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحقیق آپ کی تحقیق سے مختلف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسی کی تحقیق پر عمل کرے اور آپ کی بات کو ترک کر دے۔ اس کا رویہ اس سے مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حدیثِ رسول کے مقابلے میں فلاں عالم کی رائے کو ترجیح دی گئی۔

کیا اکثریت کی رائے حق وناحق کا معیار ہوسکتی ہے؟

سوال:

مولانا محترم! ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ ان مسالک کو مسلمانوں کے اسّی، نوّے (۸۰، ۹۰) فی صد طبقے کا اعتماد حاصل رہا ہے تو اس سلسلے میں، میں آپ کی یہ رائے جاننا چاہتا ہوں کہ اس اعتماد کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟ کیا اکثریتی رائے حق وناحق کا معیار ہوسکتی ہے؟

جواب:

میں نے ابھی کہا ہے کہ مسلمانوں نے اعتماد اس معنی میں کیا ہے کہ ان ائمہ نے کتاب وسنت کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ اختلاف صرف اس امر میں رہا ہے کہ کس مسئلے میں کس کی رائے زیادہ صحیح یا قوی ہے؟ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ فلاں مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے زیادہ قوی ہے، دوسرے کی یہ رائے ہوسکتی ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے دلائل زیادہ مستحکم ہیں۔ اسی طرح ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ فلاں مسئلے میں امام مالکؒ زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں یا امام احمدؒ کی رائے درست ہے۔ ہمارے فقہی لٹریچر کا بڑا حصہ اسی طرح کے مباحث کے اردگرد گھومتا ہے۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں ان کے مسلک کی تائید ملے گی، فقہ شافعی کی کتابوں میں ان کے مسلک کی۔ اسی طرح دوسرے مسالک کا بھی معاملہ ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ فقہ حنفی کی تائید احادیث سے نہیں ہوتی

سوال:

مولانا محترم! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ اختلافی مسائل، خاص طور پر نماز وغیرہ کے مسائل میں فقہ حنفی کی تائید عام طور سے متداول کتب حدیث یعنی صحاح ستہ کی احادیث سے نہیں ہوتی؟ کیا اس سے اس خیال کو تقویت نہیں حاصل ہوتی کہ دوسرے مسالکِ فقہ، حدیث سے زیادہ قریب ہیں؟

جواب:

اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین، جن میں سب سے اہم شخصیت امام بخاریؒ کی ہے، کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی جمع کردہ احادیث فقہ حنفی

سے بالکل مختلف ہیں۔ فقہ حنفی کے بیشتر احکام و مسائل کی تائید بخاری کی حدیثوں سے بھی ہوتی ہے اوران روایات سے بھی ہوتی ہے، جو حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ صحاح ستہ کے وجود میں آنے سے پہلے بھی اسلامی معاشرہ موجود تھا اور بہت سے اسلامی احکام و تعلیمات پر ایک تسلسل کے ساتھ بغیر کسی انقطاع کے عمل ہو رہا تھا۔ انہیں میں نماز، روزہ، حج اور زکوۃ جیسی عبادات شامل ہیں اور بعض معاملات وہ بھی ہیں، جو کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ جن احکام پر تسلسل کے ساتھ عمل جاری تھا، مختلف ائمہ کے نزدیک اس کی تائید میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپؐ کی عملی سنت اور صحابہ کرامؓ کا عمل تھا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہم نے ائمہ فقہ کے مسالک کی تائید کرنے والی احادیث تلاش کیں، لیکن وہ نہیں ملیں یا کم زور اور ضعیف ثابت ہوئیں، تو اس سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جن ائمہ کے نزدیک وہ ثابت شدہ ہیں اور جس پر سلف کا مسلسل عمل رہا ہے وہ اس پر عمل کر رہے ہیں۔ ان کے مسلک کے قوی یا کم زور ہونے پر گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان ائمہ نے جو مسائل بیان کیے ہیں وہ بے دلیل ہیں۔

ہماری فقہی تاریخ میں مختلف مسالکِ فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی ہوتا رہا ہے۔ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں علامہ ابن رشد کی 'بدایة المجتهد و نهایة المقتصد'، امام شعرانی کی 'المیزان' اور ابن ہبیرہ کی 'الافصاح عن معانی الصحاح' بڑی کارآمد اور مفید کتابیں ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ہر مسلکِ فقہ کے پاس دلائل ہیں۔ بے دلیل کسی امام یا مجتہد نے کسی مسئلے میں رائے زنی نہیں کی ہے، بلکہ ہر ایک کے پاس دلیل ہے۔ ابن رشد کا مطالعہ اس معاملہ میں بہت وسیع ہے۔ ہزاروں مسائل میں شاید گنتی کے چند مسائل ہوں گے جن کے بارے میں کسی امام کی رائے یا مسلک کے متعلق اس نے کہا ہو کہ اس کی دلیل مجھے نہیں ملی۔ اسی طرح امام شعرانی کی کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ یہ اختلافات اصولی نہیں، فروعی اور جزوی ہیں اور ان میں تطبیق بھی دی جا سکتی ہے۔

فقہی اختلافات کیسے پیدا ہوئے؟

سوال:

مولانا محترم! عوام بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے اکثر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ

امت کے اندر اس قدر فقہی اختلافات کیسے پیدا ہوئے؟ ان کی تاریخ کیا ہے؟ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ روشنی ڈال سکیں تو ہم جیسے طالب علموں پر بڑا احسان ہوگا اور ملت کا ایک بڑا طبقہ اس سے مستفید ہو سکے گا۔

جواب:

اس سوال کا جواب لمبی بحث چاہتا ہے۔ میں یہاں بہت ہی اختصار کے ساتھ اسے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دین کی اصل بنیاد قرآن اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں۔ اس میں کسی بھی شخص کو اختلاف نہیں ہے۔ قرآن تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، جب کہ احادیث میں سے صرف بعض ہی کو تواتر کا مقام حاصل ہے، زیادہ تر احادیث کی نوعیت اخبارِ آحاد کی ہے، یعنی ایک فرد نے دوسرے فرد سے انہیں نقل کیا ہے۔ قرآن مجید کا معاملہ یہ تھا کہ جو آیت یا آیات رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتیں، آپؐ اسے لکھوا دیتے، لوگوں کو سنا دیتے اور اس کو یاد کرا دیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ یاد کر لیتے تھے۔ قرآن ہر ایک کے پاس عملاً موجود تھا۔ سب اسے پڑھتے پڑھاتے، اس کے احکام معلوم کیے جاتے اور اس کے الفاظ سے استنباط ہوتا۔ احادیث کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے کوئی عمل کیا، اس کو کچھ صحابہؓ نے یا دو ایک نے دیکھا، سب نے نہیں دیکھا۔ اسے انھوں نے بیان کیا۔ ایک واقعہ پیش آیا۔ اس وقت کچھ لوگ موجود تھے اور کچھ نہیں تھے۔ جو موجود تھے، انھوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ اسی طرح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی عمل مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے ادا فرمایا۔ ایک نے ایک طریقہ اور دوسرے نے دوسرا طریقہ دیکھا۔ دونوں نے دو طریقے بیان کیے۔ اس سے دونوں کی گنجایش نکل آتی ہے۔ اس کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب ایک جگہ نہ تھے، بلکہ بہت سے مقامات پر منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں وہ گئے وہاں کے لوگوں کے لیے دینی احکام و مسائل کے سلسلے میں مرجع تھے۔ صحابہؓ کی بڑی تعداد مدینہ میں رہی، بعض کا قیام مکے میں رہا، کچھ کوفہ، بصرہ اور شام چلے گئے۔ اس منتقلی کے بہت سے اسباب تھے۔ کبھی تعلیم و تربیت کی غرض سے، کبھی جہاد اور دین کی سربلندی کے لیے، کبھی سیاسی ضرورت سے صحابہؓ کو ان مختلف مقامات پر منتقل ہونا پڑا۔ جو صحابہ جہاں تھے وہاں وہ مرجع رہے۔ اب ایک طرف تو وہ صحابہ ہیں،

جن کا قیام مدینہ میں تھا۔ انھوں نے حضور اکرم ﷺ سے بھی استفادہ کیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور بھی دیکھا، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا دور بھی دیکھا اور حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنینؓ سے بھی فیض اٹھایا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنایا۔ یہاں پہلے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور بعض اور بڑے صحابہ کرام کا قیام رہا۔ اس طرح وہ بھی ایک بڑا دینی مرکز بن گیا۔ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کا مدار بڑی حد تک کوفہ کے انھی صحابہؓ کی روایات اور علم وفقہ پر ہے۔ میں یہاں صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ذکر کروں گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا صحابہ کرامؓ کے درمیان بہت اونچا مقام ہے۔ وہ مکہ کے ابتدائی دور میں ایمان لائے، رسول اللہ ﷺ سے شب وروز کی قربت انہیں حاصل رہی، قرآن مجید کے ماہر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال سے وسیع واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی فقہی بصیرت پر امت کو بھرپور اعتماد رہا ہے۔ ان کے خاص شاگرد حضرت علقمہؒ بن قیس تھے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ خلفاء راشدین اور حضرت حذیفہؓ وغیرہ کو دیکھا اور ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ ان کے شاگرد تھے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے پیش رووں کو حضورؐ کی سنت پر عمل کرتے دیکھا، بلکہ ان کی سنت فہمی اور بصیرت سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے شاگرد حضرت حمادؒ ہیں۔ ان کا شمار کوفہ کے بڑے فقہا میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی بڑے خداترس بھی تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے کسبِ فیض کیا۔ انھی حمادؒ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حدیث وفقہ میں استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں اور بھی اصحاب علم ہیں۔ اس طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحابیِ رسول اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے درمیان صرف تین واسطے پائے جاتے ہیں اور یہ واسطے بہت مضبوط، قوی اور قابل اعتماد ہیں۔ زیادہ تر مسائل وہ ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ہم تک ان صحابہ سے یہ روایتیں اور یہ عمل پہنچا ہے اور ان اہم شخصیات کے واسطے سے پہنچا ہے جن کی فقاہت اور بصیرت مسلم ہے۔ جس وقت امام ابوحنیفہؒ یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے یہ بات میرے استاد حمادؒ نے بیان کی اور ان سے ابراہیم نخعیؒ نے، ان سے علقمہؒ نے اور ان سے عبداللہ بن مسعودؓ نے تو اس سند کو چیلنج کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کم از کم امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے پاس جو بات ان واسطوں سے پہنچتی ہے، وہ ان کے لیے حجت ہوجاتی ہے اور اس کے مقابلے میں وہ کسی اور کی بات کو اہمیت نہیں مانتے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آپ فلاں مسئلہ میں جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ ضعیف ہے، تو اس سے کہا جائے گا کہ ٹھیک ہے، یہ حدیث جن واسطوں سے پہنچی ہے، وہ آپ کے نزدیک ضعیف اور کمزور ہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ اسے ضعیف نہ قرار دیں۔ اگر اس حدیث پر اس کے راویوں کا عمل بھی ہو تو وہ اس کی تقویت کا مزید ثبوت ہوگا۔

حدیث جانچنے کے اصول اور اقوالِ ائمہ

سوال:

مولانا محترم! کیا اس سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ محدثین کرام اور ائمۂ جرح وتعدیل نے حدیث کو جانچنے کے جو اصول وضع کیے ہیں اور ان کی بنیاد پر حدیث کی صحت وضعف کے جو فیصلے کیے ہیں، وہ ناقابل اعتبار ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اس لیے اصل فیصلہ ائمہ کے اقوال و مسالک پر ہونا چاہیے؟

جواب:

محدثین نے حدیث کے راویوں کے حالات جمع کرنے اور ان کی سیرت کی چھان بین اور روایات کی کیفیت جاننے کے لیے جو اصول وضع کیے اور جو تگ ودو کی، یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ اور امت پر بڑا احسان ہے۔ امت ان کے اس احسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ حدیث کے راویوں کے سلسلے میں ان کی رایوں میں بھی اختلاف ہے۔ جہاں بعض راوی بالاتفاق ان کے نزدیک معتبر اور بعض غیر معتبر ہیں، اسی کے ساتھ بہت سے راوی وہ بھی ہیں، جن کے بارے میں خود محدثین کی رائیں مختلف ہیں۔ ایک راوی کو بعض محدثین ضعیف اور غیر معتبر سمجھتے ہیں، جب کہ اسی راوی کو بعض دوسرے محدثین قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل امام ذہبی کی 'میزان الاعتدال' اور حافظ ابن حجر کی 'لسان المیزان' جیسی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حدیث کی صحت وضعف کا فیصلہ کرنے میں بسا اوقات اس وجہ سے بھی دقت پیش آتی ہے کہ ایک ہی حدیث کسی کے نزدیک ضعیف اور ناقابل استدلال اور کسی کے نزدیک قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

صحیح حدیث کی موجودگی میں دوسری رائے اختیار کرنے کی وجہ

سوال:

مولانا محترم! بہ راہِ کرم یہ بتائیں کہ حدیث صحیح کی موجودگی میں اس کے خلاف جانے یا دوسری رائے اختیار کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

جواب:

اسے کسی قدر تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پوری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ سامنے آئے، سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ قرآن کریم اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ پھر حدیث کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس کے بعد خلفاے راشدین اور دیگر صحابہ کا تعامل دیکھا جائے گا۔ اگر کوئی حدیث قرآن شریف کے ظاہر الفاظ کے خلاف جاتی ہے تو فقہاء احناف اسے تسلیم نہیں کرتے یا توجیہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سند کے صحیح ہونے کے باوجود اس کا بہر حال امکان ہے کہ کسی راوی سے یا راویوں سے اس کے سننے، سمجھنے، یاد رکھنے یا بیان کرنے میں کہیں کوئی چوک ہوئی ہو۔ ایسے مواقع پر امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ قرآن کے حکم کے خلاف حضور ﷺ کا کوئی عمل ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے اس کے خلاف کوئی روایت ملتی ہے تو ہم اسے قبول نہیں کریں گے یا توجیہ کریں گے۔ امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال فقہا کی راے یہ ہے کہ ایسی صورت میں، جب کہ حدیث صحیح اور معتبر و مستند واسطوں سے ہم تک پہنچی ہے، ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا منشا یہی ہے اور اس کی یہی صحیح تعبیر ہے۔ یہ ان ائمہ کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

سوال:

مولانا محترم! یہ نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ زحمت فرما کر چند مثالیں بھی پیش فرما دیں، تاکہ مسئلے کی تفہیم و ترسیل بہ آسانی ہو سکے؟

جواب:

مثال کے طور پر امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے، کیونکہ قرآن کریم میں صاف طور سے کہا گیا ہے کہ 'جب قرآن پڑھا جائے تو دھیان سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم

پر رحم کیا جائے۔' (الاعراف: ۲۰۴) یہ ایک نصِ صریح ہے۔ یہ آیت کس پس منظر میں نازل ہوئی اور اس کی شانِ نزول کیا ہے؟ یہ بات دوسری ہے۔ لیکن اس میں صاف طور پر قرآن کی تلاوت کے وقت سکوت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے امام صاحب فاتحہ خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں کہ امام کا سورۂ فاتحہ پڑھنا مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ احناف کی طرف سے اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہوسکتی ہے، لیکن ہمارے مسلک کے لیے یہ حدیث اصل بنیاد نہیں ہے۔ ہمارے مسلک کی بنیاد تو قرآن ہے، البتہ اس حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری طرف امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ کا کہنا ہے کہ ہم تک صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث پہنچی ہے کہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی اور کسی معاملے میں صحیح حدیث موجود ہو تو اس کے خلاف جانا درست نہیں ہے۔ اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف ہے تو اس کی ایسی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ قرآن پر بھی عمل ہو جائے اور حدیث پر بھی۔ وہ اس طرح کہ امام سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے، اس دوران میں مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں۔ لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ یہ بات خود اپنے آپ میں غلط ہے کہ امام لوگوں کے خیال سے خاموش کھڑا رہے، جب کہ نماز میں تسلسل ہونا چاہیے، زیادہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ نماز ایک مسلسل عمل ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ مقتدیوں کے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے لیے حضور ﷺ نے سکوت اختیار کیا ہو۔ نماز کے بارے میں ہمیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ سب سے پہلے یہ عمل ہو، اس کے بعد یہ اور اس کے بعد یہ۔ اس میں کہیں امام کے خاموش رہنے کا ذکر نہیں ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ حدیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ حضور ﷺ نماز میں دو سکتے فرماتے تھے۔ ایک تکبیر تحریمہ کے بعد اور دوسرا سورۂ فاتحہ کے بعد۔ امام ابوحنیفہؒ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ کسی حدیث میں سکتہ کا وقفہ اتنا بتایا گیا ہے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ سکے۔

ادھر امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے حکم کے مطابق نماز جہری ہو اور امام قرآن پڑھ رہا ہو تو ہم سکوت کریں گے، اس وقت کچھ نہیں پڑھیں گے، لیکن جب امام سری نماز پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی خاموشی سے قرأت کرے گا۔ امام محمدؒ، جو امام ابوحنیفہؒ کے خاص شاگرد ہیں،

کہتے ہیں کہ مجھے اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مقابلے میں امام مالکؒ کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں قرآن اور حدیث دونوں پر عمل ہورہا ہے۔ اس مثال سے بہ خوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ مسالک میں کس طرح اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

یہاں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک مسئلہ میں صحیح اور قوی روایات نہیں ہوتیں تو کم زور روایات ہی میں سے کسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی مثال نماز میں ہاتھ باندھنے کا مسئلہ ہے۔

حضرت وائل بن حجرؓ کی روایت ہے کہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ہوتا اور آپ انہیں سینہ پر رکھتے۔ یہ حدیث ابن خزیمہؒ اور بیہقی نے روایت کی ہے۔ اس پر بہت سے اصحابِ فقہ کا عمل ہے۔

دوسری طرف حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنی ایک ہتھیلی دوسری ہتھیلی پر زیر ناف رکھے۔ یہ حدیث مسند احمد اور ابوداؤد میں آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اس مفہوم کی روایت آئی ہے۔ اس پر احناف کا عمل ہے۔ موجودہ دور کے مشہور سلفی عالم فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے مروی روایت کی سند کم زور ہے۔ وائل بن حجرؓ کی حدیث میں بھی گو کسی قدر ضعف ہے لیکن صحت سے قریب ہے اس لیے قابل ترجیح ہے۔ (فتاویٰ ارکان الاسلام، ص ۳۱۵، ۳۱۶)

اس تفصیل سے یہ بات بہ آسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ ائمہ دین میں سے کوئی بھی امام نہ تو قرآن کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے اور نہ حدیث کو۔ مسئلہ صرف ان کو سمجھنے اور ان کے درمیان مطابقت کا ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ یہ سب حضرات اپنی اپنی جگہ مخلص ہیں۔ ایسے میں جس کو جو مسلک زیادہ بہتر اور قوی معلوم ہو اسے اس مسلک کے اپنانے کا اختیار ہے۔ اس پر اعتراض یا ردّ وکد درست نہیں ہے۔

ایک حکم پر متعدد طریقوں سے عمل کا ثبوت

سوال:

مولانا محترم! آپ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کا عمل دیکھا، وہ خود بھی اس کے مطابق عمل کرنے لگے۔ پھر صحابہ میں سے کوئی مصر چلا گیا، کوئی شام اور کوئی عراق چلا گیا تو اس سے ان

کے آپس کے عمل میں اختلاف کیسے پیدا ہوگیا؟ کیا خود حضورؐ کے عمل میں بھی کوئی اختلاف ہوتا تھا کہ کبھی ایک عمل کیا اور دوسرے وقت اس کے برخلاف کوئی دوسرا عمل کیا؟

جواب:

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ احادیث کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے عمل اور طریقہ میں بعض اوقات لچک اور گنجایش ہوتی تھی۔ اس طرح کے امور میں جس صحابی نے جس عمل کو جس شکل میں آپ کو انجام دیتے دیکھا، اسے یاد رکھا اور اس کے مطابق عمل کیا، دوسروں کو بھی یہی بتایا اور اس کی روایت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس طرح کے معاملات میں ہمارے پاس بسا اوقات اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ نے پہلے کون سا عمل اختیار کیا اور بعد میں کون سا۔ جہاں یہ ثبوت مل جاتا ہے کہ پہلے فلاں حکم تھا، بعد میں وہ منسوخ ہوگیا اور اس کی جگہ فلاں دوسرا حکم آ گیا وہاں تو بالعموم اختلاف نہیں ہوتا، لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں اختلاف کا امکان رہتا ہے اور اختلاف ہوتا بھی ہے۔ حضور ﷺ نے ایک ہی حکم کی تعمیل میں کبھی کوئی طریقہ اور کبھی دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے، تو اس سے ہمیں کسی الجھن میں پڑنے یا برسرِ پیکار ہونے کی بجائے یہ سمجھنا چاہیے کہ خود شریعت نے اس میں لچک اور گنجایش رکھی ہے۔

تقلید کا آغاز کب ہوا؟

سوال:

مولانا محترم! آپ نے بڑے مدلل اور اطمینان بخش جوابات سے مستفید فرمایا۔ میں سمجھتا ہوں، ایسی بے لاگ مگر معتدل و متوازن گفتگو اس سلسلے میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں اس زحمت فرمائی کے لیے اپنی طرف سے اور سہ روزہ 'دعوت' کے تمام قارئین کی طرف سے آپ کا ممنون و مشکور ہوں۔ بہ راہِ کرم اب یہ بتانے کی زحمت کریں کہ تقلید اور عدم تقلید کے مابین کیا کوئی ایسا بنیادی یا اصولی فرق ہے، جس کا تعلق ایمان و عقیدے سے ہو اور یہ بھی کہ اس کا آغاز کب سے ہوا؟

جواب:

جی نہیں! اس مسئلے میں ایسا کوئی فرق نہیں ہے، جس کا تعلق ایمان اور عقیدہ سے ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ صحابہ کرامؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ براہ راست قرآن کریم سے استفادہ کرتے تھے۔ کوئی الجھن

ہوتی تو رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمالیتے تھے۔آپ کے بیان کردہ احکام و مسائل سنتے تھے اور جو مسئلہ درپیش ہوتا، اسے آپ سے دریافت کر لیتے تھے۔خود آپ کے عمل کے مشاہدے کا بھی انھیں موقع حاصل تھا۔آپؐ کے بعد یہ صورت حال نہیں رہی۔صحابہ کرامؓ جو آپ کی تعلیمات سے براہ راست واقف تھے، وہ دور دور تک اطراف عالم میں پھیل گئے۔ جہاں وہ تھے ان سے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور احکام شریعت معلوم کیے جانے لگے اور دینی امور میں ان سے اخذ و استفادہ شروع ہو گیا۔صحابۂ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور آیا۔ان میں جو اصحاب دینی علم اور فقہی بصیرت میں ممتاز اور نمایاں تھے، ان کی طرف رجوع ہونے لگا۔یہیں سے ائمہ کرام کا بھی دور شروع ہوتا ہے۔انھیں اپنے علم و فضل، تقویٰ وطہارت اور دین داری کی وجہ سے اپنے اپنے حلقوں میں خاص اعتماد حاصل تھا۔اس کی وجہ سے ایک حلقے کے لوگ اپنے امام کے قول کو دوسرے حلقے کے امام کی رائے کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے۔ان کے دلائل انھیں زیادہ قوی محسوس ہوئے۔اسی کو تقلید کہا جاتا ہے۔جو لوگ احکام دین سے واقفیت نہیں رکھتے یا کم واقفیت رکھتے ہیں اور جن میں اخذ و استنباطِ مسائل کی صلاحیت نہیں ہے، ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہیں کہ وہ کسی صاحب علم کی تحقیق پر اعتماد کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔البتہ جو اصحاب وسیع دینی علم اور گہری بصیرت کے حامل ہیں، انھیں اس کا حق ہے کہ مسائل پر غور و فکر کریں اور اپنی رائے رکھیں۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

سوال:

مولانا محترم! کہا جاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کئی سو سال پہلے بند ہو چکا ہے۔اب کوئی اجتہاد نہیں کرسکتا؟ میں اس سلسلے میں آپ کا نقطۂ نظر جاننا چاہتا ہوں۔

جواب:

اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔جن لوگوں نے اس طرح کی بات کہی ہے، اس کا ایک پس منظر ہے۔ایک دور تھا جب اس وقت تک پیش آنے والے مسائل پر بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی تھی۔فقہی مسائل پر مشتمل چھوٹی بڑی تصنیفات اور تالیفات شرح و بسط کے ساتھ ترتیب دی جا چکی تھیں۔اس زمانے میں آج کی سی سائنسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور صنعتی ترقی نہیں

ہوئی تھی۔ حالات میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی اور مسائل محدود تھے۔ اس لیے اس وقت تک کے تمام مسائل مرتب شکل میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ کئی سو سال تک شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آیا ہو، جس پر ابتدائی دور میں غور نہ ہوا ہو اور قدیم علماء نے اس پر بحث نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ اب سے تین سو سال پہلے جب اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں علماء نے علمی مجالس منعقد کر کے اور بحث و مباحثہ کے بعد 'فتاویٰ عالم گیری' جیسی کتاب ترتیب دی تو اس میں بھی ایسے بہت زیادہ مسائل آپ کو نہیں ملیں گے، جو پہلے سے کتابوں میں موجود نہ ہوں۔ ان حالات میں یہ بات کہی گئی کہ اب اجتہاد کی عملاً کوئی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ جو مسائل اجتہاد کے طالب تھے، وہ سب حل کیے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ احساس بھی رہا کہ اگر لوگوں کو اجتہاد کی کھلی چھوٹ دے دی جائے گی تو کم علم اور بے بصیرت لوگ اسلامی احکام کے ساتھ کھلواڑ کرنے لگیں گے۔ جیسا کہ آج دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بعض دوسرے میدانوں کے ماہرین اور دانش ور خود کو اسلام کا ماہر سمجھتے اور اسلام کے نام پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی قرآن و سنت پر کوئی خاص نظر نہیں ہے، وہ اسلامی احکام و ہدایات کی تشریح کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح کی صورت حال کے سد باب کے لیے اجتہاد کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ جہاں تک نئے مسائل کا تعلق ہے، ان پر ہمیشہ غور ہوتا رہا ہے اور آج بھی عصر حاضر کی ترقی کے باعث جو مسائل پیدا ہوئے ہیں اور توجہ طلب ہیں ان پر برابر علماء غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس طرح کی کوشش لازماً ہونی چاہیے اور الحمدللہ ایسی کوشش ہو رہی ہے۔

تمام مسالک ختم کر کے ایک متفقہ مسلک ترتیب دینا ممکن ہے نہ مطلوب

سوال:

مولانا محترم! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام مسالک ختم ہو جائیں اور صرف ایک ہی مسلک اتفاقِ رائے سے ترتیب دے دیا جائے؟

جواب:

یہ ناممکن ہے۔ آپ ساری باتیں سن چکے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات میں لچک ہے، فقہی اختلاف کی

حقیقی بنیادیں موجود ہیں، قرآن اور احادیث کے احکام پر عمل درآمد کے سلسلے میں ائمہ دین اور علماء امت کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور آیندہ بھی یہ اختلاف رہے گا۔ ایسے میں تمام مسالک کو ختم کر کے ایک ہی مسلک تشکیل دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ غور و فکر کی آزادی باقی نہ رہے، اور اجتہاد کے دروازے بند ہو جائیں۔ اس طرح دین میں غور و خوض کے سوتے خشک ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات میں جو لچک پائی جاتی ہے اس کو ختم کر دیا جائے اور دین اسلام جو آسان دین ہے، اس کو مشکل اور دشوار بنا دیا جائے۔

کیا تمام مسالکِ فقہ سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

سوال:

مولانا محترم! آپ کی گفتگو سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے اور عام مسلمانوں کے اندر بھی یہ خیال جاگزیں ہے کہ چاروں فقہی مسالک برحق ہیں، ان سب کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ پھر کیوں نہ کسی ایک فقہ کی پابندی کی بجائے ان سب سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا جائے؟

جواب:

میرے خیال میں یہ بات ناجائز نہیں، بلکہ جائز اور پسندیدہ ہے کہ مختلف مسالکِ فقہ سے استفادہ کیا جائے۔ آج کل کا علمی رجحان بھی یہی ہے۔ چنانچہ فقہی موضوعات پر جو کتابیں، خاص طور پر، عربی زبان میں تصنیف ہو رہی ہیں یا جو معاجم اور انسائیکلوپیڈیا مرتب ہو رہے ہیں، ان میں یہی نہیں کہ چاروں مسالکِ فقہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، بلکہ دیگر مسالکِ فقہ سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور جو رائے کتاب و سنت کی روشنی میں قوی ہوا سے ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ بہت اچھا رجحان ہے۔ امید ہے اس سے دل و دماغ کی گرہیں کھلیں گی اور تعصّبات کم ہوں گے۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مختلف مسالک فقہ کے درمیان موازنہ اور ان میں ترجیح ایک نازک اور مشکل کام ہے۔ اسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے، جسے علوم دین میں گہری بصیرت حاصل ہو، جو ہر مسلکِ فقہ کے دلائل سے اچھی طرح واقف ہو اور ان کی قوت و ضعف کا فیصلہ کر سکتا ہو۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ دین ایک مذاق بن کر رہ جائے، آدمی اپنی خواہش، ذاتی رجحان اور سہولت کے لیے مسالک فقہ کا جائزہ لے اور حسب موقع کسی مسلک کو اختیار کر بیٹھے۔

اتحاد واتفاق کی دینی بنیادیں

سوال:

مولانا محترم! کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ کتاب وسنت وہ کون سی بنیادیں فراہم کرتی ہیں، جن پر مختلف مسالک کے لوگ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے اتحاد واتفاق کے ساتھ چل سکتے ہیں؟

جواب:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا ہے کہ آپ اہلِ کتاب سے کہہ دیجیے کہ 'آؤ ہم سب مل کر ان باتوں پر متحد ہو جائیں جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہیں۔' (آل عمران: ۶۴) جب یہ بات یہود ونصاریٰ سے کہی جاسکتی ہے تو خود مسلمانوں پر اس کا اطلاق کیوں نہیں ہوسکتا؟ جب ہم متفق علیہ امور پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں تو خود آپس میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ علامہ اقبالؔ نے کہا:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

نماز پڑھنے سے کسی کو اختلاف نہیں۔ البتہ اس کے طریقے میں کہیں کہیں اختلاف ہے۔ روزہ رکھنے میں کسی کو اختلاف نہیں، اس سے متعلق شاید دو ایک مسائل میں اختلاف ہوگا، حج کرنے سے کسی کو اختلاف نہیں، اس سلسلے کے بعض ضمنی اور فروعی مسائل میں اختلاف ہے۔ کلیات اور اصول دین ایک ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، فروعی وضمنی باتوں اور جزئیات میں اختلاف ہے۔ اس کے لیے باہم برسرِ پیکار اور برسرِ نزاع ہونا کوئی دانائی کی بات نہیں ہے۔ ہمیں اتحاد واتفاق پیدا کرنے اور جوڑنے والی باتوں پر زور دینا چاہیے۔ نزاع اور اختلاف و انتشار والی باتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے، خود بہ خود اتحاد واتفاق پیدا ہو جائے گا۔

فقہی مسالک کے بارے میں جماعت اسلامی ہند کا موقف

سوال:

مولانا محترم! میں نے آپ کو بہت زحمت دی، آپ نے میرے سوالات کے تفصیلی اور شافی جوابات مرحمت فرمائے۔ اب آخر میں میں آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ آپ جماعت اسلامی ہند کے امیر اور اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کے معزز رکن ہیں۔ بہ راہِ کرم اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں کہ ان مسالک کے بارے میں جماعت کا اپنا موقف کیا ہے؟

جواب:

جماعت فقہی مسالک سے تعرض نہیں کرتی۔ اس کا مقصد اقامت دین ہے۔ دین کی دعوت کیسے دی جائے؟ وہ کیسے عام ہو؟ اس پر کیسے عمل ہو؟ اقامت دین کی راہیں کیسے کھلیں اور عملاً دین کیسے قائم ہو؟ یہ ہے جماعت کی کوششوں کا ہدف۔ یہی اس کا مقصد ہے۔ انھیں باتوں پر وہ زور دیتی اور توجہ صرف کرتی ہے۔ امت میں اختلاف اور انتشار کے ہر پہلو سے بچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں آپ ہر فقہی مسلک اور ہر مکتب فکر کے لوگوں کو شامل پائیں گے۔ جماعت میں جہاں بڑی تعداد فقہ حنفی پر عمل کرنے والوں کی ہے، وہیں ہمارے بہت سے رفقاء اہلِ حدیث ہیں۔ کیرلا اور ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بیشتر رفقا شافعی مسلک رکھتے ہیں۔ خود مرکز جماعت میں جماعت کے ذمے داروں میں ہر مسلک کے لوگ شامل ہیں۔ مرکز کی مسجد میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں نماز پڑھنے والوں میں رفعِ یدین کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں اور عدمِ رفع کے قائل بھی ہیں۔ زیر ناف ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے والے بھی ہیں اور سینہ پر ہاتھ باندھنے والے بھی۔ یہاں تک کہ اس مسجد میں فرض نماز اور جمعہ کی نماز کبھی حنفی مسلک کا عالم پڑھاتا ہے تو کبھی اہلِ حدیث عالم بھی پڑھا دیتا ہے اور کبھی شافعی مسلک کا آدمی بھی۔ جماعت سب کے لیے اپنے اپنے مسلک پر عمل پیرا رہتے ہوئے اور اختلافات سے بچتے ہوئے اقامت دین کا پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔

☆☆